ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY

Name:

Registration No.:

Course Code: 2630

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: مقاصد شریعہ (2630) • سطح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 6-9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 6 تا 9) کورس کے دوسرے حصے پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی پانچ سوالات ہیں، ہر سوال 20 نمبر کا ہے؛ کل نمبر 100 اور کامیابی کے نمبر 40 ہیں۔ ان سوالات میں دین کا مفہوم و دنیا و آخرت کا ربط، مصلحتِ تحسینیہ، تعددِ ازدواج، حاکم کی ذمہ داریاں و اختیارات اور احکامِ تکلیف کی اقسام شامل ہیں۔ خاندانی و سیاسی

موضوعات میں بھی یاد رہے کہ عملی فیصلے ملکی قانون اور مستند علماء کی رہنمائی کے تابع ہوتے ہیں۔ اس گائیڈ میں ہر جواب مفصل و منظم انداز میں پیش کیا گیا ہے، جہاں مناسب ہوا جدول و شکل بھی شامل کی گئی ہے، تاکہ طالب علم مفاہیم اچھی طرح سمجھ کر جواب اپنے الفاظ میں تحریر کر سکے۔

سوال نمبر 1: دین کا مفہوم اور دنیا و آخرت کا باہمی ربط (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ دین کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم واضح کریں۔ نیز، دلائل سے ثابت کریں کہ دنیا اور آخرت دین کے دو الگ الگ شعبے نہیں بلکہ باہم مربوط اور یکجا ہیں۔ (20)

تعارف

دین انسانی زندگی کا سب سے بنیادی تصور ہے۔ انسان کائنات میں اپنی حیثیت، زندگی کا مقصد اور مرنے کے بعد کے انجام جیسے سوالات کا جواب دین ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اس سوال کے دو حصے ہیں: پہلے دین کے لغوی و اصطلاحی مفہوم کی وضاحت درکار ہے اور دوسرے یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام میں دنیا اور آخرت دو جدا جدا خانے نہیں بلکہ ایک ہی زندگی کے دو مربوط مراحل ہیں۔ اس دوسرے حصے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ بعض ذہنوں میں دین کو صرف آخرت کی تیاری اور دنیا کو اس سے بالکل کاٹ کر دیکھا جاتا ہے، جبکہ بعض دوسرے لوگ دنیا کو سب کچھ سمجھ کر آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسلام کا اعتدال ان دونوں انتہاؤں سے الگ ہے۔ اس جواب میں تعریف و دائرے کے بعد عقلی و نقلی دلائل اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دنیا و آخرت کے ربط کو تفصیل سے واضح کیا جائے گا اور آخر میں نتیجہ پیش کیا جائے گا۔

مقاصد شریعہ کے تناظر میں بھی یہ سوال اہم ہے، کیونکہ شریعت کے تمام احکام کا مقصد دنیا میں انسان کی فلاح اور آخرت میں اس کی نجات ہے۔ اگر دنیا و آخرت الگ سمجھ لیے جائیں تو احکام کا ایک بڑا حصہ بے معنی ہو جاتا ہے؛ معاملات، اخلاق، معاشرت اور ریاست کے احکام اسی دنیا کے لیے ہیں مگر ان کا ثمر آخرت میں ملتا ہے۔ اس کے برعکس اگر صرف دنیا کو مقصد بنا لیا جائے تو عبادات و اخلاقیات کی بنیاد کمزور پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا دین کے صحیح مفہوم کو سمجھنا اس کورس کے ہر آئندہ موضوع کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

دین کا لغوی مفہوم

دین عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معانی میں جزا و بدلہ، اطاعت و فرمانبرداری، عادت و طریقہ اور حساب و فیصلہ شامل ہیں۔ قرآن مجید میں یوم الدین کا مطلب جزا کا دن ہے، اسی سے دین کے مفہوم میں جواب دہی اور انجام کا تصور نمایاں ہوتا ہے۔ عرب کے محاوروں میں دین کا مطلب کسی کی اطاعت اختیار کرنا اور کسی قانون کے آگے جھکنا بھی آتا ہے۔ اسی لغوی پس منظر سے یہ سمجھ آتا ہے کہ دین محض چند رسوم کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی مکمل فرمانبرداری ہے جس میں انسان کسی بالاتر ہستی کے حکم کو اپنی زندگی کا قانون تسلیم کرتا ہے اور اس کے اچھے برے نتائج کا یقین رکھتا ہے۔ الفاظ کے یہ تمام مفاہیم اصطلاحی تعریف میں جمع ہو جاتے ہیں۔

دین اور مذہب میں فرق بھی لغوی بحث ہی سے واضح ہوتا ہے۔ مذہب کا لفظ جانے کے راستے سے ماخوذ ہے اور عام طور پر ہر اس طریقے کو کہا جاتا ہے جسے کوئی قوم اختیار کرے، خواہ وہ وحی پر مبنی ہو یا انسانی ساختہ ہو۔ دین بالخصوص قرآن کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اس نظام کو کہا جاتا ہے جس کی بنیاد وحی ہے۔ اسی طرح دین اور ملت کی اصطلاحات بھی قریب ہیں مگر قرآن میں دین کا استعمال زندگی کے مکمل نظام کے لیے زیادہ جامع انداز میں ہوتا ہے۔ ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ لفظ دین کا اطلاق دنیا کے دنیاوی قوانین و اطاعتوں پر بھی لغت میں ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرتاً کسی نہ کسی نظام کے آگے سر تسلیم خم کرنے والا ہے؛ سوال صرف یہ ہے کہ وہ نظام وحی الٰہی کا دیا ہوا ہو یا انسانوں کا بنایا ہوا۔

دین کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ اس جامع ہدایت کو کہتے ہیں جو عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور معاشرت سمیت انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی رہنمائی کرے اور انسان کو دنیا میں اللہ کی رضا اور آخرت میں نجات کا راستہ دکھائے۔ اسلام کی نظر میں دین صرف ایک اعتقادی مذہب نہیں، اس میں نظام حیات کی مکمل صورت موجود ہے۔ اسی لیے علماء نے دین کی تعریف میں یہ الفاظ بھی شامل کیے ہیں کہ دین انبیاء علیہم السلام کے ذریعے پہنچا وہ الٰہی قانون ہے جس کو قبول کرنے والا دنیا میں

امن وعدل اور آخرت میں فلاح حاصل کرتا ہے۔ اس تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین کا دائرہ مسجد و عبادت گاہ تک محدود نہیں بلکہ گھر، بازار، دفتر اور ریاست سب اس کے حلقہ اثر میں آتے ہیں۔

اسلام کو قرآن نے دین حق اور دین قیم جیسی تعبیرات سے یاد کیا ہے جن کا مطلب ہے سچا اور سیدھا و مضبوط نظام زندگی۔ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسی دین کی آخری و مکمل صورت ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہونے والی ہدایت کا تسلسل ہے۔ فرق صرف شرائع و احکام کی جزئیات میں زمانے کے حساب سے آیا۔ اس تکملیت کے بعد انسان کو زندگی کے کسی شعبے میں رہنمائی کے لیے دین سے باہر جھانکنے کی حاجت نہیں رہتی۔ البتہ نئے مسائل میں اجتہاد کا دروازہ اصولوں کے اندر رہتے ہوئے کھلا ہے۔ دین کی یہ جامعیت ہی اسے محض پوجا پاٹ سے الگ کر کے ایک تہذیبی و سماجی نظام بناتی ہے، اور یہی وہ پس منظر ہے جس میں دنیا و آخرت کے ربط کی بحث درست سمجھی جا سکتی ہے۔

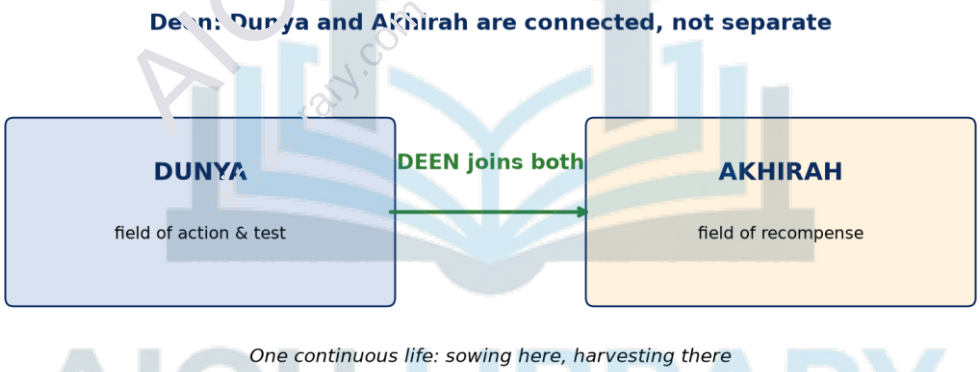

شکل: دنیا و آخرت کا باہمی ربط — دین کا جامع تصور (مطالعے کے لیے خاکہ)

دنیا اور آخرت: دو مراحل، ایک زندگی

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کی زندگی دو مراحل پر پھیلی ہوئی ہے: دنیا اس کا پہلا اور عارضی مرحلہ ہے جہاں اسے عمل کی مہلت دی گئی ہے، اور آخرت اس کا مستقل مرحلہ ہے جہاں اسے اپنے عمل کا پھل ملے گا۔ قرآن مجید نے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دینے کا مفہوم متعدد انداز میں بیان کیا ہے کہ جو یہاں بوئے گا وہی وہاں کاٹے گا۔ یہ

مثال دونوں جہانوں کے ربط کو سب سے بہتر طور پر سمجھاتی ہے؛ کھیتی اور فصل کو الگ نہیں کیا جاسکتا، کھیتی کا مقصد ہی فصل ہے اور فصل کا انحصار کھیتی پر ہے۔ اسی طرح دنیا کا ہر نیک یا برا عمل آخرت میں جزا و سزا کی صورت میں سامنے آئے گا۔ جو شخص دنیا کو کھیتی سمجھتا ہے وہ یہاں کی محنت کو بے کار نہیں سمجھ سکتا، اور جو آخرت کو فصل سمجھتا ہے وہ بھی کھیتی سے غافل نہیں رہ سکتا۔ یہی باہمی ربط دین کے اس تصور کی جان ہے۔

اسلام نے رہبانیت یعنی دنیا چھوڑ کر جنگلوں میں عبادت کرنے کو ابتدا سے نہیں بنایا؛ نکاح، کسب معاش، خاندان کی کفالت اور معاشرتی خدمت کو بھی دین و ثواب کا کام قرار دیا گیا بشرطیکہ نیت درست اور طریقہ حلال ہو۔ اسی لیے ایک مسلمان کا بازار میں ایمان داری سے کاروبار کرنا، اپنے اہل و عیال پر حلال سے خرچ کرنا اور کسی کی مدد کرنا بھی عبادت کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جدید مادہ پرستانہ فکر نے دین کو نجی معاملہ قرار دے کر دنیا کو دین سے کاٹنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اخلاقی قدریں کاروبار و سیاست سے نکل گئیں۔ اسلام اس علیحدگی کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا کا نظام بھی دین کی اخلاقی ہدایات کے مدرجے گا، تب ہی دنیاوی نظام میں عدل و امانت قائم ہو سکتے ہیں۔

دنیا و آخرت کے ربط کے دلائل

پہلی دلیل قرآن کی وہ عمومی تعلیم ہے جس میں دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں کھیل و تماشا کہنے کے باوجود اس کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ دنیا میں اپنا حصہ نہ بھولنے اور احسان و نیکی کی زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس توازن سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی نفی نہیں بلکہ اس کی آخرت کے تابع ترتیب مقصود ہے۔ دوسری دلیل عبادات کی سماجی و دنیوی حکمتوں کی موجودگی ہے؛ زکاۃ معاشی نظام کو درست کرتی ہے، روزہ اخلاقی تربیت پیدا کرتا ہے، حج عالمی اجتماعیت کا نمونہ ہے اور نماز دن بھر کی دنیاوی زندگی کو پابندی وقت میں ڈھالتی ہے۔ اگر دین صرف آخرت کا شعبہ ہوتا تو عبادات میں دنیوی معاشرت کی یہ حکمتیں نہ رکھی جاتیں۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ قرآن نے دنیاوی نعمتوں جیسے مال، اولاد، حکومت اور زراعت کو بھی ایمان و عمل صالح کے ساتھ نعمت قرار دیا اور کفار کی دنیاوی ترقی کو ان کے بارے میں حتمی کامیابی نہیں سمجھا، یعنی کامیابی کا اصل معیار دنیاوی نتیجہ نہیں بلکہ آخرت کا نتیجہ ہے، مگر دنیا اس نتیجے کا میدان ضرور ہے۔

چوتھی دلیل نظام اخلاق و قانون کا وجود ہے۔ اگر دنیا دین کا شعبہ نہ ہوتی تو خرید و فروخت، وراثت، قصاص و حدود اور گواہی و معاہدوں کے تفصیلی احکام شریعت میں نہ آتے؛ یہ تمام احکام اسی دنیاوی زندگی کو منظم کرنے کے لیے ہیں مگر ان کی مراعات کو دینی فریضہ اور ان کی خلاف ورزی کو گناہ قرار دیا گیا، یعنی دنیا کا کام بھی دینی جواب دہی میں داخل ہے۔ پانچویں دلیل عقل و تجربے کی بھی یہی ہے کہ انسان کے دنیاوی رویے کا اخلاقی معیار کسی مستقبل کی جواب دہی کے یقین کے بغیر کمزور پڑ جاتا ہے؛ آخرت کا یقین ہی ہے جو خلوت میں بھی انسان کو ظلم و خیانت سے روکتا ہے جہاں کوئی دنیاوی قانون نافذ نہیں ہوتا۔ یوں دین نے دنیا و آخرت کو ایک زنجیر کی دو کڑیاں بنا دیا ہے، ایک عمل کی دنیا اور دوسری نتیجے کی دنیا، اور دونوں کا مالک و حاکم ایک ہی خدا ہے۔

عملی نتائج: متوازن دینی زندگی

دنیا و آخرت کے ربط کو تسلیم کرنے کے عملی نتائج بڑے ہمہ گیر ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دنیاوی ترقی کو دین کے مخالف نہیں سمجھتا؛ تعلیم، طب، صنعت اور سائنس میں محنت بھی دینی جذبے سے ہو سکتی ہے جب مقصد خدمت خلق اور حلال روزی ہو۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ دنیاوی ناکامی یا کامیابی کو وہ اپنا آخری فیصلہ نہیں سمجھتا، اس لیے مایوسی و غرور دونوں سے بچتا ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ سماجی اصلاح بھی عبادت بن جاتی ہے، کیونکہ ظلم مٹانا، حق دلانا اور بھلائی کا حکم دینا سب آخرت کے بدلے سے جڑا ہے۔ چوتھا نتیجہ یہ کہ انسان کی نجی زندگی میں بھی احتساب زندہ رہتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کا ہر رویہ آخرت کے کھاتے میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ توازن اسلام کو ان نظاموں سے ممتاز کرتا ہے جو یا تو صرف روحانیت پر زور دے کر دنیا چھڑواتے ہیں یا صرف مادیت پر زور دے کر آخرت بھلواتے ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ دین لغت میں جزا، اطاعت اور قانون کے آگے تسلیم کا نام ہے اور اصطلاح میں اللہ کی نازل کردہ وہ مکمل ہدایت ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس دین میں دنیا اور آخرت دو الگ الگ شعبے نہیں بلکہ ایک ہی زندگی کے دو مربوط مراحل ہیں جن میں سے دنیا عمل و کھیتی کی جگہ ہے اور آخرت جزا و فصل کی جگہ۔ قرآن کی تعلیمات، عبادات کی دنیوی حکمتیں، شرعی قانون کا وجود اور عقل کا تقاضا سب اسی ربط کی تصدیق کرتے ہیں۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ نہ دنیا کو دین کے مقابل

کھڑا دیکھے اور نہ آخرت کو دنیا سے کاٹ کر؛ اس کی دینی زندگی کا اصل حسن یہی ہے کہ اس کا ہر دنیاوی عمل حلال و پاکیزہ طریقے سے ہو اور اس کی نگاہ اس کے اخروی نتیجے پر بھی رہے۔ یہی توازن مقاصد شریعہ میں دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کا خلاصہ ہے۔

سوال نمبر 2: مصلحتِ تحسینیہ — تعریف، مثالیں اور مقاصد شریعہ میں اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ مصلحتِ تحسینیہ کی تعریف اور مثالوں سے وضاحت کریں۔ مقاصد شریعہ میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ (20)

تعارف

مقاصد شریعہ کی بحث میں مصلحتوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ضروریات، حاجیات اور تحسینیات۔ سوال میں تیسرے درجے یعنی مصلحت تحسینیہ زیر بحث ہے۔ بظاہر یہ درجہ سب سے نچلا ہے، مگر اس کی درست سمجھ بوجھ کے بغیر مقاصد کا پورا نظام سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ شریعت صرف انسان کی بنیادی زندگی بچانے یا اس کی مشقت دور کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کی زندگی کو حسن، تہذیب اور شائستگی سے آراستہ بھی کرتی ہے۔ اس جواب میں پہلے مصلحت اور مقاصد کا مختصر پس منظر دیا جائے گا، پھر تحسینیات کی تعریف اور اس کی خصوصیات بیان ہوں گی، اس کے بعد عبادات، معاملات، معاشرت اور قانون سے اس کی روشن مثالیں پیش کی جائیں گی، اور آخر میں مقاصد شریعہ میں اس درجے کی اہمیت و حدود پر نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ تحسینیات کو بیان کرتے وقت دو انتہاؤں سے بچنا ضروری ہے۔ ایک طرف ان کو بالکل بے اہمیت سمجھ کر نظر انداز کر دینا درست نہیں، کیونکہ شریعت کا ایک بڑا حصہ اسی خوش اسلوبی و تہذیب کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف ان کو ضروریات کے درجے پر لے جانا بھی درست نہیں، کیونکہ اس سے لوگوں پر وہ بوجھ آ جائے گا جو شریعت نے ان کی سہولت کے لیے نہیں رکھا تھا۔ اصولیین نے اسی لیے ہر درجے کی الگ شرطیں اور الگ ترجیحی قواعد وضع کیے ہیں کہ ضرورت کے وقت تحسینی کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر تحسینی کی خاطر ضروری کو چھوڑنا جائز نہیں۔ یہی درجہ بندی مقاصد شریعہ کو ایک منظم ترجیحی نظام بناتی ہے جس سے قانون ساز اور فقیہ کو فیصلے میں رہنمائی ملتی ہے۔

پس منظر: مصلحت اور اس کی درجہ بندی

مصلحت لغت میں منفعت و بھلائی اور مفسدہ کے مقابل نفع پہنچانے کو کہتے ہیں۔ مقاصد کی اصطلاح میں مصلحت سے مراد وہ تمام فوائد ہیں جن کی حفاظت و حصول شریعت کے احکام کا مقصود ہے، اور اس کی بلند ترین صورت پانچ ضروریات کی حفاظت ہے یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال۔ امام غزالی سے لے کر امام شاطبی تک کے اصولیین نے ان مصلحتوں کو تین درجوں میں رکھا ہے۔ پہلا درجہ ضروریات کا ہے جن کے بغیر دنیا و دین کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، جیسے جان و مال کی حفاظت کے قوانین۔ دوسرا درجہ حاجیات کا ہے جو زندگی کو آسان بناتی ہیں اور مشقت دور کرتی ہیں، جیسے سفر میں روزے کی رخصت اور مختلف جائز معاہدے۔ تیسرا درجہ تحسینیات کا ہے جو زندگی کو خوبصورت، مہذب اور باوقار بناتی ہیں۔ ان تینوں درجوں کا باہمی تناسب یہ ہے کہ اوپر والے درجے کی حفاظت نیچے والے درجے سے مقدم ہے، مگر نیچے والا درجہ اوپر والے درجے کی تکمیل و زینت کا کام بھی کرتا ہے۔

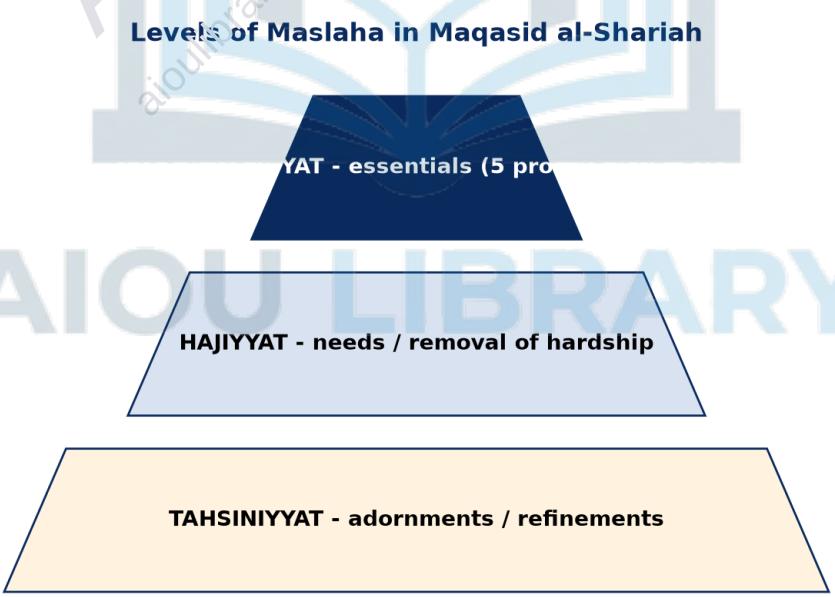

شکل: مصلحت کے تین درجے — ضروریات، حاجیات اور تحسینیات (مطالعے کے لیے خاکہ)

مصلحتِ تحسینیہ کی تعریف

مصلحت تحسینیہ سے مراد وہ مصلحتیں ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی کے حسن، تہذیب، شائستگی اور عمدہ اخلاق و آداب سے ہو، جن کے چھوٹ جانے سے نہ زندگی کا نظام درہم برہم ہوتا ہے اور نہ انسان کسی بڑی مشقت میں پڑتا ہے، بلکہ زندگی کا جمال، سکون اور وقار کم ہو جاتا ہے۔ تحسین کے لفظی معنی ہی کسی چیز کو اچھا و خوبصورت بنانا ہیں۔ امام شاطبی کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ تحسینیات کا مطلب مکارم اخلاق کا اختیار کرنا اور ان عادات و آداب سے بچنا ہے جنہیں سلیم فطرت ناپسند کرتی ہے۔ اس تعریف سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ تحسینیات کا میدان زیادہ تر آداب، اخلاق اور ظاہری و باطنی پاکیزگی ہے؛ دوسری یہ کہ ان کا معیار شریعت و سلیم عقل کی مشترکہ پسند ہے، محض رسم و فیشن نہیں؛ تیسری یہ کہ یہ تکمیلی درجہ ہے جو ضروریات و حاجیات کی عمارت کو مکمل و دلکش بناتا ہے۔

تحسینیات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اکثر احکام کا درجہ وجوب کا نہیں بلکہ استحباب و مندوب کا ہوتا ہے، یا وہ ایسے امر و نہی ہوتے ہیں جن سے مقصود تہذیبی تربیت ہے۔ مثال کے طور پر خوشبو لگانا، صاف ستھرا لباس پہننا بلا اسراف، مہمان نوازی میں کشادگی، سلام میں پہل کرنا اور راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا ایسی نیکیاں ہیں جن کے ترک کرنے پر دنیاوی سزا نہیں مگر ان کا اہتمام انسان کی سماجی قدر کو بلند کرتا ہے۔ اسی طرح بعض تحسینی ممانعتیں بھی ہیں، جیسے عبادت دکھاوے سے بچانا یا فخر و نمود کی نمائش سے اجتناب، جن کا مقصد زندگی کو سادگی و اخلاص سے آراستہ رکھنا ہے۔ یوں تحسینیات کا نظام مثبت آداب اور منفی ممانعت دونوں صورتوں میں سامنے آتا ہے۔

مثالیں: عبادات و معاشرت سے

عبادات میں تحسینیات کی مثالیں بہت نمایاں ہیں۔ نماز کے لیے وضو فرض درجے کا طہارتی عمل ہے مگر مسواک کرنا، اچھا لباس اختیار کرنا اور جمعہ کے دن غسل و خوشبو مکارم و تحسین کے درجے میں آتے ہیں جن کی ترغیب احادیث میں آئی ہے۔ مسجد میں سکون و وقار سے آنا، صفوں کو درست کرنا اور جماعت میں نظم و ضبط بھی عبادت کی تحسینی صورت ہے۔ صدقہ دینا بعض صورتوں میں فرض کے درجے کی زکاۃ ہے مگر اس سے بڑھ کر خفیہ صدقہ، مسکین کو عزت سے دینا اور لینے والے کو ذلیل نہ کرنا تحسینی اخلاق

ہے۔روزے میں صرف کھانا پینا چھوڑنا اصل ہے مگر زبان کی حفاظت، نظر کی حفاظت اور نرم گفتگو اسی روزے کی تحسینی تکمیل ہے۔ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت عبادت کو خشک رسم نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے انسان کی شخصیت کی جھلک بنا دیتی ہے۔

معاشرت و معاملات میں بھی تحسینیات کا جال بچھا ہوا ہے۔کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے و بسم اللہ پڑھنے کی آداب، دائیں ہاتھ سے کھانا، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، گفتگو میں سچائی و نرمی اور وعدہ نبھانے میں کشادگی سب تحسینی زندگی کے اجزا ہیں۔خرید و فروخت میں لین دین کی آسانی، قرض دار کو مہلت دینا بلکہ اسے معاف کر دینا، ملازم کے ساتھ نرمی اور مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کی تعلیم یہ بتاتی ہے کہ اسلام کی معیشت صرف جائز و ناجائز کی لکیر پر نہیں کھڑی بلکہ احسان کے درجے تک لے جاتی ہے۔اسی طرح طہارت کے آداب، نجاست سے اجتناب کی تہذیبی صورتیں اور مقابر و عوامی جگہوں کی پاکیزگی بھی اسی ضمن کی مثالیں ہیں۔ان آداب کا مجموعی نتیجہ ایک صاف ستھرا، با اخلاق اور دوسروں کا خیال رکھنے والا معاشرہ ہے۔

جدول: تحسینیات کی منتخب مثالیں اور ان کا پہلو

تحسینی پہلو	مثال	شعبہ
عبادت میں وقار و جمال	جمعہ میں غسل، مسواک، خوشبو	عبادات
احسان و فراخ دلی	قرض دار کو مہلت یا معافی	معاملات
حسن اخلاق و تہذیب	سلام، مہمان نوازی، نرم گفتگو	معاشرت
پاکیزگی و سماجی ذوق	صفائی، راستے کی رکاوٹ ہٹانا	طہارت و آداب

مقاصدِ شریعہ میں تحسینیات کی اہمیت

تحسینیات کی پہلی اہمیت یہ ہے کہ یہ ضروریات و حاجیات کی حفاظت کو مکمل کرتی ہیں۔ جو معاشرہ صرف جان و مال کی حفاظت پر کھڑا ہو مگر اخلاق و تہذیب سے خالی ہو وہ قانونی طور پر چل تو سکتا ہے مگر انسان دوست نہیں بن سکتا۔ تحسینیات اسی کمی کو پورا کرتی ہیں اور قانون کی سختی کو اخلاق کی نرمی سے جوڑتی ہیں۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ انسان کی سلیم فطرت کی تربیت کرتی ہیں؛ عادات و آداب اگرچہ بظاہر چھوٹی باتیں لگتی ہیں مگر یہی روزانہ دہرائے جانے والے اعمال کردار بناتے ہیں اور بری عادتوں کے لیے دل میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔ تیسری اہمیت دعوتی ہے؛ حسن اخلاق اور صاف ستھری معاشرت خود دین کی سچی تصویر پیش کرتی ہے جس سے غیر مسلم بھی متاثر ہوتے ہیں، جبکہ خوش اخلاقی کے فقدان سے اچھے اصول بھی لوگوں کو قریب نہیں کر پاتے۔

چوتھی اہمیت یہ ہے کہ تحسینیات قانون و اجتہاد میں فیصلے کا ایک مخصوص اصول دیتی ہیں۔ جہاں کسی معاملے میں قطعی نص نہ ہو وہاں اہل علم دیکھتے ہیں کہ کون سی صورت مکارم اخلاق اور عام شائستگی کے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح دو جائز صورتوں میں اچھی صورت کا انتخاب بھی اسی ذوق کا نتیجہ ہوتا ہے تاہم اس کی ایک حد بھی مقاصد کے نظام میں واضح ہے: تحسینیات کبھی ضروریات پر مقدم نہیں ہو سکتیں۔ اگر کسی جگہ کسی تحسینی عمل کے اہتمام سے جان کی حفاظت یا کسی فرض کی ادائیگی متاثر ہو تو شریعت کی ترجیح ضروری کے حق میں ہو گی۔ اسی طرح کسی تحسینی بات کو لازمی قرار دے کر لوگوں کو مشقت میں ڈالنا مقصد کو الٹا کر دیتا ہے۔ لہٰذا تحسینیات کی اہمیت ان کے درست درجے کے اندر ہے، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ اس توازن کے ساتھ یہ درجہ شریعت کی جامعیت کی دلیل بن جاتا ہے کہ وہ انسان کو محض زندہ و آسان زندگی ہی نہیں بلکہ خوبصورت و باوقار زندگی بھی دینا چاہتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مصلحت تحسینیہ مقاصد شریعہ کا تیسرا اور تکمیلی درجہ ہے جس کا تعلق حسن، تہذیب، شائستگی اور مکارم اخلاق سے ہے۔ اس کی مثالیں عبادات کے آداب، معاملات کے احسان، معاشرت کے حسن سلوک اور طہارت و صفائی کی تربیت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ضروریات و حاجیات کی عمارت کو انسانیت

کے حسن سے مکمل کرتی ہے، کردار سازی کرتی ہے اور دین کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے، مگر اس کا درجہ تکمیلی ہی رہتا ہے اور ضرورت کے وقت اسے اونچے درجے کی مصلحت پر قربان کیا جاتا ہے۔ طالب علم کے لیے اس سوال کا سبق یہ ہے کہ وہ دین کو صرف ممنوعات و فرائض کی فہرست نہ سمجھے بلکہ اس کے تہذیبی و اخلاقی جمال کو بھی اپنی زندگی میں جگہ دے، کیونکہ مکمل دینی شخصیت اسی سے بنتی ہے۔

سوال نمبر 3: شریعتِ اسلامیہ میں تعددِ ازدواج — تصور، شرعی اصول اور حکمتیں (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ شریعتِ اسلامیہ میں تعددِ ازدواج (Polygyny) کا تصور کیا ہے اور اس کے شرعی اصول و حکمتیں کیا ہیں؟ (20)

تعارف

تعدد ازدواج سے مراد ایک مرد کا بیک وقت ایک سے زیادہ یعنی شرعی حد کے اندر بیویاں رکھنا ہے، جسے انگریزی میں پولی گنی کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اسلامی خاندانی نظام کے ان موضوعات میں سے ہے جن پر جدید دور میں سب سے زیادہ بحث ہوئی ہے، اس لیے اس کا مطالعہ جذبات کے بجائے اصول و حکمت کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید نے سورہ نساء میں اس کی اجازت کو عدل کی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تعداد بھی متعین کر دی ہے، جبکہ اس سے پہلے کے معاشروں میں اس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ اس جواب میں پہلے اس کا تصور و تاریخی پس منظر، پھر اس کے شرعی اصول و شرائط اور آخر میں فقہاء و مفسرین کی بیان کردہ حکمتوں کے ساتھ اس کے غلط استعمال کی روک تھام پر نتیجہ پیش کیا جائے گا۔ کسی انفرادی کیس میں اجازت یا ممانعت کا عملی فیصلہ ملکی قانون اور اہل علم کی رہنمائی کے تابع ہے، جس کا ذکر جواب میں احتیاط کے ساتھ آئے گا۔

ابتدا میں دو اصطلاحی فرق بھی واضح رہیں۔ ایک تعدد ازدواج کی وہ صورت ہے جس میں مرد کی متعدد بیویاں ہوں، یہی یہاں زیر بحث ہے۔ دوسری صورت جس میں ایک عورت کے متعدد شوہر ہوں اسے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ اس سے نسب کا اختلاط اور خاندانی نظام کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی یاد رہے کہ اسلام نے

تعدد ازدواج کو فرض یا لازم حکم کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ مخصوص حالات میں اسے ایک مشروط اجازت کے طور پر برقرار رکھا ہے اور عام اصل کے طور پر ایک بیوی پر اکتفا اور اس کے ساتھ حسن سلوک کو ہی معمول کی زندگی قرار دیا ہے۔ اس درجہ بندی کو سمجھے بغیر اس مسئلے پر متوازن رائے قائم نہیں ہو سکتی۔

تصور اور تاریخی پس منظر

اسلام سے پہلے دنیا کے اکثر معاشروں میں تعدد ازدواج موجود تھا، کہیں کوئی تعداد مقرر نہیں تھی اور عورتوں کے حقوق کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی۔ عرب کے جاہلی معاشرے، قدیم یہودی و عیسائی سماجی روایات، ایران، ہندوستان اور چین کی پرانی تہذیبوں میں بھی اس کی صورتیں ملتی ہیں اور بعض اوقات بیویوں کی تعداد دسیوں تک پہنچ جاتی تھی اور ان کے درمیان عدل و حقوق کی کوئی نظام مندی نہیں ہوتی تھی۔ اسلام نے اس موجود رسم کو یکسر ختم کرنے کے بجائے اس کی اصلاح کی: تعداد کو زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کیا، عدل کو شرط قرار دیا اور ہر بیوی کے نان و نفقہ، رہائش اور حسن معاملے کے حقوق لازم کیے۔ یہ طرزِ اصلاح شریعت کے اس عمومی اسلوب کی مثال ہے کہ وہ رائج انسانی معاملات کو یک دم اکھاڑنے کے بجائے ان کو انصاف کے ڈھانچے میں ڈھالتی ہے، جیسا کہ غلامی کے تدریجی خاتمے اور دیگر سماجی اصلاحات میں بھی نظر آتا ہے۔

قرآنی ہدایت کے پس منظر میں یہ بھی نقل ہوا ہے کہ اس کا ذکر یتیم بچیوں کے حقوق کے سیاق میں آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت کا ایک اہم پس منظر کمزور و بے سہارا خواتین کی کفالت و حفاظت بھی تھا، محض خواہش کی تسکین نہیں۔ دوسری طرف قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا جائے، اور عدل کی عملی دشواری کی طرف اشارہ کر کے مردوں کو اس معاملے میں خدا خوفی کی تلقین کی۔ اس لیے علماء نے اس اجازت کو غیر مشروط رعایت کے بجائے ذمہ داری بھری رعایت قرار دیا ہے کہ جو شخص اس کی مالی و اخلاقی شرائط پوری نہ کر سکے اس کے لیے اس راستے پر چلنا خود اس کے اپنے حق میں بھی نقصان دہ ہے۔ پاکستان سمیت بہت سے مسلم ممالک میں اس موضوع پر ملکی خاندانی قوانین بھی موجود ہیں جن کی پابندی شہری ذمہ داری ہے؛ شریعت کی تعلیم بھی نظم و قانون کی پابندی کی حمایت کرتی ہے۔

شرعی اصول و شرائط

اس باب کے شرعی اصول چند بنیادی نکات میں خلاصہ کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا اصول تعداد کی حد ہے کہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں کسی صورت جائز نہیں۔ دوسرا اصول عدل کی شرط ہے کہ شوہر بیویوں کے درمیان نان و نفقہ، رہائش، وقت کی تقسیم اور ظاہری برتاؤ میں انصاف کرے؛ دلی محبت جیسی غیر اختیاری چیز میں برابری انسان کے بس میں نہیں، مگر اختیاری امور میں واضح ناانصافی گناہ ہے۔ تیسرا اصول استطاعت ہے کہ مرد کے پاس اس قدر حلال آمدنی و وسائل ہوں کہ وہ دونوں گھرانوں کے حقوق ادا کر سکے؛ جو شخص ایک ہی گھر کی کفالت سے عاجز ہو اس کے لیے دوسرا نکاح ذمہ داری بڑھانے کے سوا کچھ نہیں۔ چوتھا اصول ہر بیوی کے کامل حقوق ہیں کہ ہر ایک کا مہر، نفقہ، عزت و راز داری الگ محفوظ رہے اور کسی کو دوسری کی خاطر محروم نہ کیا جائے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ یہ سہولت کسی عورت پر جبر کا ذریعہ نہ بنے؛ نکاح کی بنیاد خود رضامندی ہے اور ظلم کی ہر صورت حرام ہے۔

ان اصولوں کے ساتھ چند عملی قواعد بھی فقہاء بیان کرتے ہیں۔ نکاح کی شرائط میں اگر کوئی فریق شریعت کے اندر رہتے ہوئے کوئی جائز شرط رکھے تو اس کا احترام لازم آتا ہے۔ بچوں کے نسب، وراثت اور کفالت کے حقوق ہر نکاح میں یکساں محفوظ رہتے ہیں اور تعدد کی وجہ سے ان میں کمی نہیں آتی۔ ریاست و قانون کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ سماجی مصلحت کے تحت نکاح کی رجسٹریشن، اجازت و اطلاع جیسے انتظامی ضوابط بنائے تاکہ خواتین و بچوں کے حقوق غائب نہ ہوں؛ ایسے ضوابط شریعت کے مقصد یعنی حقوق کی حفاظت ہی کی خدمت کرتے ہیں۔ اگر عملی زندگی میں کوئی مرد ان شرائط کو توڑ کر ظلم کرے تو اس کا عمل شریعت کی اجازت کی دلیل نہیں بنتا، بلکہ وہ خود اپنے ظلم کا جواب دہ ہے اور متاثرہ فریق کو عدالت و اہلِ علم سے رجوع کا حق حاصل ہے۔

جدول: تعددِ ازدواج کے شرعی اصول — ایک نظر میں

اصول	مفہوم	خلاف ورزی کا نتیجہ
تعداد کی حد	بیک وقت زیادہ سے زیادہ چار بیویاں	حد سے تجاوز شرعاً باطل عمل ہے

ظاہری ناانصافی پر گناہ و جواب دہی	نفقہ، رہائش و برتاؤ میں انصاف	عدل
عاجز کے لیے یہ راستہ ذمہ داری کا بوجھ ہے	حلال کفالت کی مالی و اخلاقی طاقت	استطاعت
حق تلفی پر عدالتی رجوع کا حق	ہر بیوی کا مہر و نفقہ و عزت محفوظ	کامل حقوق
حقوق کے تحفظ کے لیے انتظامی لازمہ	رجسٹریشن و ملکی ضوابط کا احترام	قانون کی پابندی

تعددِ ازدواج کی حکمتیں

فقہاء و مفسرین نے اس اجازت کی کئی حکمتیں بیان کی ہیں جن کو سماجی ضرورت کے دائرے میں دیکھنا چاہیے۔ پہلی حکمت جنگوں و وباؤں کے بعد بیواؤں اور یتیموں کی کفالت ہے، جہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے بڑھ جاتی ہے اور بے سہارا خواتین کو باعزت خاندانی سہارا ملتا ہے۔ دوسری حکمت نسل کی جنات کے ان حالات میں ہے جہاں پہلی بیوی بانجھ ہو یا طویل بیماری کی وجہ سے ازدواجی زندگی ممکن نہ ہو اور مرد طلاق کی اذیت کے بجائے پہلی بیوی کے حقوق برقرار رکھتے ہوئے دوسرا نکاح کرنا چاہے، یوں دونوں گھرانے برقرار رہتے ہیں۔ تیسری حکمت معاشرتی بے راہ روی کی روک تھام ہے کہ جہاں اس اجازت کا دروازہ بالکل بند ہو وہاں بعض سماجوں میں غیر شادی شدہ تعلقات اور خاندان سے باہر کے روابط پھیلنے کا خطرہ بڑھتا ہے، جبکہ اس نظام میں ہر تعلق ذمہ داری و حقوق کے ساتھ ہوتا ہے۔ چوتھی حکمت بعض جغرافیائی و سماجی حالات میں آبادی و خاندانی استحکام بھی بیان کی گئی ہے۔

ان حکمتوں کے بیان کے ساتھ علمی انصاف کا تقاضا ہے کہ ان حدود کو بھی سامنے رکھا جائے جو معاصر علماء دہراتے ہیں۔ یہ اجازت ایک استثنائی سماجی حل ہے، روزمرہ کی خواہش پوری کرنے کا عام نظام نہیں۔ بہت سے گھرانوں میں بغیر حقیقی ضرورت اور بغیر استطاعت کے کیا گیا دوسرا نکاح پہلے گھر کو تباہ اور بچوں کو محرومی میں مبتلا کر دیتا ہے، جو مقاصد شریعہ کی روح کے خلاف ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حکمت ضرورت کے وقت ظاہر ہوتی ہے، ورنہ اصل سکون و رحمت والا نظام وہی ہے جو قرآن نے مودت و رحمت کی بنیاد

پر ایک پائیدار زوجیت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ طالب علم کے لیے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس اجازت کو نہ تو مغربی پروپیگنڈے کی نظر سے دیکھے اور نہ اسے بے قید رعایت سمجھے، بلکہ شرائط و حکمت کے توازن سے اس کا مطالعہ کرے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ تعدد ازدواج اسلام کی ایجاد کردہ رسم نہیں بلکہ انسانیت کی پرانی سماجی صورت ہے جسے اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار کی حد، عدل کی شرط، استطاعت اور کامل حقوق کی ضمانت کے ساتھ منظم کیا ہے۔ اس کے شرعی اصول ظلم کی ہر صورت کو بند کرتے ہیں اور اس کی حکمتیں بیواؤں و یتیموں کی کفالت، نسل کی حفاظت اور معاشرتی بدکاری کی روک تھام جیسی حقیقی ضرورتوں سے جڑی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے ہے کہ عدل نہ کر سکنے والے کے لیے ایک پر اکتفا ہی قرآن کی ہدایت ہے اور ملکی قانون کی پابندی و اہل علم سے رجوع ہر عملی کیس کی لازمی تدبیر ہے۔ اس متوازن تصور کو سمجھنا ہی اس سوال کا اصل حاصل ہے، جس سے خاندان کے مقصد یعنی سکون، مودت اور رحمت کی حفاظت ہوتی ہے۔

سوال نمبر 4: شریعت میں حاکم کی ذمہ داریاں و اختیارات اور اسلامی نظریہ حاکمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ شریعت میں حاکم (امیر / خلیفہ) کی ذمہ داریاں اور اختیارات کیا ہیں؟ حاکمیت کے اسلامی نظریات کی روشنی میں بیان کریں۔ (20)

تعارف

ریاست اور حکمرانی انسانی معاشرے کی ناگزیر ضرورت ہے، کیونکہ امن، عدل اور حقوق کی حفاظت کسی منظم اقتدار کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلام نے اس شعبے کو بھی رہنمائی سے خالی نہیں چھوڑا؛ قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کے تعامل میں حاکم کے انتخاب، اس کی ذمہ داریوں اور اس کے اختیارات کی حدود کے اصول ملتے ہیں۔ سوال میں پہلے حاکم یعنی امیر یا خلیفہ کی ذمہ داریاں و اختیارات پوچھے گئے ہیں اور پھر انہیں حاکمیت کے اسلامی نظریے کی روشنی میں سمجھنے کا تقاضا ہے۔ اس جواب میں پہلے نظریہ حاکمیت کی

وضاحت ہو گی کہ اسلام میں اصل حاکمیت کس کی ہے، پھر خلیفہ و امیر کے مفہوم اور انتخاب کے اصول، پھر اس کی ذمہ داریاں، پھر اس کے اختیارات و ان کی حدود اور آخر میں معاصر تناظر کے ساتھ نتیجہ پیش کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ بیان علمی اصولوں کا ہے؛ کسی موجودہ حکومت یا شخصیت کے بارے میں عملی فیصلہ اس جواب کا موضوع نہیں۔

اسلامی سیاسی فکر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقتدار کو ملکیت نہیں بلکہ امانت سمجھا گیا ہے۔ حاکم قوم کا مالک نہیں بلکہ اس کا خادم و نگران ہے، اور اس کی اطاعت بھی مطلق نہیں بلکہ معروف یعنی شریعت و عدل کے اندر مشروط ہے۔ اسی اصول سے اسلام کا سیاسی نظام آمریت سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور اس لادین جمہوریت کے اس تصور سے بھی مختلف رہتا ہے جس میں قانون سازی کی حاکمیت کا کوئی اعلیٰ اخلاقی پیمانہ نہیں ہوتا۔ اسلامی نظریے میں قانون کی بالادستی وحی کی ہدایت کو حاصل ہے اور انسانی ادارے اس کے اندر رہ کر انتظامی قانون سازی کرتے ہیں۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر حاکم کے فرائض و اختیارات کو دیکھا جائے تو ان کی اصل روح سمجھ میں آتی ہے۔

اسلامی نظریہ حاکمیت

اسلام کے مطابق حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، کیونکہ کائنات کا خالق و مالک وہی ہے اور انسان سمیت ہر چیز اسی کے حکم کے تابع ہے۔ قرآن نے اس اصول کو حکم صرف اللہ کے لیے ہونے کے مفہوم سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں انسانی حکومت قائم نہیں ہو گی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی حکمرانی اللہ کے دیے ہوئے اصولوں کے تابع اور اس کے سامنے جواب دہ ہو گی۔ اسی سے دوسرا تصور خلافت کا نکلتا ہے کہ انسان زمین میں اللہ کا نائب ہے اور سیاسی سطح پر خلیفہ اسی امانت کا بڑا نگران ہے۔ قوم و امت بھی اس خلافت میں شریک ہے، اس لیے حکمرانی کا نظام ایک فرد کی جاگیر نہیں بلکہ امت کی اجتماعی امانت ہے جسے شوریٰ یعنی مشورے سے چلایا جاتا ہے۔ حاکمیت الٰہی، خلافت انسانی اور شوریٰ کا نظام یہ تین تصورات مل کر اسلامی نظریہ حاکمیت کی بنیاد بناتے ہیں۔

اس نظریے کے چند عملی نتائج بھی اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ کوئی حاکم شریعت کے قطعی اصولوں کے خلاف قانون نہیں بنا سکتا، کیونکہ وہ خود قانون سے بالاتر نہیں۔ دوسرا یہ کہ حاکم کی اطاعت معروف میں ہے؛ اگر وہ کسی ناجائز کام کا حکم دے تو اس مخصوص حکم میں اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی، البتہ اس کا مطلب ہر شخص کو بغاوت کا لائسنس دینا بھی نہیں، فقہاء نے فساد کے اندیشے کی بنا پر اس باب میں صبر و قانونی طریقے کی تاکید بھی کی ہے اور اس توازن کی تفصیل سیاسی فقہ کی کتب میں موجود ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ

اقلیتوں و غیر مسلم شہریوں کے حقوق بھی اسی حاکمیت الٰہی کے انصاف کے تحت محفوظ ہیں، کیونکہ عدل کا حکم ہر انسان کے لیے عام ہے۔ چوتھا یہ کہ حاکم کا احتساب ایک دینی اصول ہے؛ خلیفہ وقت بھی اپنے آپ کو عوام کے سوال و احتساب سے باہر نہیں سمجھتا تھا، جو خلفائے راشدین کے طرز عمل سے ظاہر ہے۔

حاکم کا مفہوم، انتخاب اور اہلیت

اسلامی اصطلاح میں امت کے سب سے بڑے اجتماعی نظم کے نگران کو امام، امیر المومنین یا خلیفہ کہا جاتا ہے، جبکہ کسی علاقے یا محکمے کے ذمہ دار کو بھی امیر کہتے ہیں۔ خلیفہ رسول کے اس سیاسی جانشین کو کہا گیا جو دین کی حفاظت اور دنیا کے نظم و نسق کی ذمہ داری نبھاتا ہے۔ اس منصب کے لیے فقہاء نے اہلیت کی شرائط بیان کی ہیں جن میں اسلام، بلوغت و عقل، عدالت یعنی دینی و اخلاقی اعتبار سے قابل اعتماد ہونا، علم و فہم، انتظامی صلاحیت اور جسمانی و ذہنی اہلیت شامل ہیں۔ انتخاب کا طریقہ اہل حل و عقد یعنی اہل علم و اہل رائے کی شوریٰ اور امت کی بیعت یعنی اعتماد کے اظہار سے طے پاتا تھا۔ تاریخی صورتوں میں اس کی مختلف شکلیں رہی ہیں، مگر اصول یہی ہے کہ اقتدار زبردستی قبضے کا نام نہیں بلکہ اعتماد و امانت کا نام ہے۔

بیعت کا تصور اس نظام میں دو طرفہ عہد ہے؛ عوام معروف میں اطاعت کا وعدہ کرتے ہیں اور حاکم عدل و خدمت کا عہد کرتا ہے۔ اس عہد کی خلاف ورزی پر احتساب کے دروازے علمی و قانونی سطح پر کھلے رہتے ہیں۔ جدید دور میں انتخاب و پارلیمانی نظام کی صورتوں کو بہت سے علماء نے اسی شوریٰ و اعتماد کے اصول کے تحت دیکھا ہے، اگرچہ صورتوں میں اختلافات پر علمی مباحث موجود ہیں۔ طالب علم کے لیے اہم بات یہ ہے کہ صورت سے زیادہ اصول دیکھا جائے: حاکم کا چناؤ اہلیت و اعتماد سے ہو، منصب امانت رہے اور احتساب کا نظام موجود ہو۔ اس اصول کے بغیر محض نام بدلنے سے اسلامی حکمرانی قائم نہیں ہوتی اور اس اصول کے ساتھ مختلف جائز انتظامی صورتیں وقت و مکان کے حساب سے اختیار کی جا سکتی ہیں۔

حاکم کی ذمہ داریاں

حاکم کی سب سے بڑی ذمہ داری دین و قانون کی حفاظت اور عدل کا قیام ہے۔ اس میں حدود و قوانین کا منصفانہ نفاذ، عدالتوں کا نظام، کمزور کو طاقت ور سے حق دلانا اور ظلم کی روک تھام شامل ہے۔ دوسری ذمہ داری امن عامہ کا قیام ہے یعنی جان و مال و عزت کی حفاظت، سرحدوں و داخلی نظم کی نگرانی اور فساد و بغاوت کی شرعی حدود کے اندر روک تھام، بشرطیکہ یہ طاقت عدل کے ساتھ استعمال ہو۔ تیسری ذمہ داری رعایا کی معاشی و سماجی فلاح ہے؛ بیت المال یعنی خزانے کو امانت سمجھ کر ضرورت مندوں، یتیموں و مسکینوں کی کفالت، زکاۃ و مالیات کا منصفانہ نظام اور عوامی سہولتوں کی فراہمی اسی میں آتی ہے۔ چوتھی ذمہ داری انتظامی تقرریوں میں اہلیت کا لحاظ ہے کہ عہدے میرٹ و امانت داری پر دیے جائیں، اقربا پروری و رشوت کا راستہ بند ہو اور ہر اہل کار اپنے محکمے کا جواب دہ ہو۔ پانچویں ذمہ داری خارجہ تعلقات و دفاع میں امت کے مفاد کی نگرانی اور معاہدوں کی پاسداری بھی ہے۔

ان فرائض کی ادائیگی میں حاکم کے لیے چند اخلاقی صفات بھی لازم قرار دی گئی ہیں: خدا خوفی، کیونکہ احتساب کا اصل احساس یہی ہے؛ سچائی و امانت، کیونکہ جھوٹ و خیانت سے عوام کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے؛ نرمی و بردباری، کیونکہ سختی و انتقام سے نظم عارضی رہتا ہے؛ اور مشورے کی عادت، کیونکہ تنہا رائے غلطی کا شکار ہوتی ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں خزانے میں ذاتی تصرف سے پرہیز، عوام کے سامنے جواب دہی اور اہل کاروں پر کڑی نگرانی اسی ذمہ داری کی عملی مثالیں ہیں جن کا تذکرہ اسلامی تاریخ میں غیر معمولی اہتمام سے ملتا ہے۔ ان مثالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کی عظمت اس کے پروٹوکول سے نہیں بلکہ اس کی خدمت و جواب دہی سے ناپی جاتی ہے۔

جدول: حاکم کی بڑی ذمہ داریاں

مقصد	ذمہ داری	شعبہ
حقوق کی حفاظت و ظلم کی روک	منصفانہ نفاذ، عدالتی نظام	قانون و عدل
معاشرے کا استحکام	جان، مال، عزت کا تحفظ	امن عامہ

معاشی انصاف و سماجی تحفظ	بیت المال کی امانت داری، کفالت	مالیات و فلاح
کارکردگی و اعتماد	اہل افراد کی تقرری، احتساب	انتظامیہ
ریاست کی سلامتی و وقار	مفاد کی نگرانی، معاہدے کی پاسداری	خارجہ و دفاع

حاکم کے اختیارات اور ان کی حدود

ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے حاکم کو وسیع انتظامی اختیارات بھی دیے گئے ہیں۔ وہ قوانین کے نفاذ کے لیے انتظامی احکام جاری کر سکتا ہے، جرائم کی روک تھام کے لیے تعزیری پالیسی بنا سکتا ہے، مالیات کے نظام میں حالات کے مطابق جائز صورتیں اختیار کر سکتا ہے، اہل کار مقرر و معزول کر سکتا ہے، مصالح عامہ کے تحفظ کے لیے شوریٰ کے مشورے سے فیصلے کر سکتا ہے اور جنگ و صلح کے بڑے فیصلے بھی اسی کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ اجتہادی و انتظامی مسائل میں اس کے فیصلے کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اجتماعی نظم اختلافات کے خاتمے کا تقاضا کرتا ہے، اسی لیے فقہاء کے یہاں یہ اصول پایا جاتا ہے کہ حاکم کا فیصلہ عملی اختلاف کو رفع کر دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فیصلہ کسی قطعی نص کے خلاف نہ ہو۔

ان اختیارات کی حدود بھی ہم اتنی ہی واضح ہیں۔ پہلی حد یہ ہے کہ حاکم شریعت کے قطعی احکام کو معطل یا ان کے خلاف مستقل قانون نہیں بنا سکتا۔ دوسری حد یہ ہے کہ وہ عوام کے جان و مال و عزت میں بلاوجہ شرعی تصرف نہیں کر سکتا؛ ٹیکس و مالی مطالبے بھی عدل و ضرورت اور قانون کے اندر رہیں گے۔ تیسری حد شوریٰ و احتساب ہے کہ اہم امور میں مشورہ اور جواب دہی کا نظام موجود رہے۔ چوتھی حد مقصد کی ہے کہ اختیار ذاتی مفاد، خاندانی اقتدار یا انتقام کے لیے استعمال نہ ہو۔ اگر حاکم ان حدود سے نکلے تو اس کی غلطی کو غلطی ہی کہا جائے گا اور علمی و قانونی سطح پر اس کی اصلاح کی کوشش اسلامی سیاسی فکر کی روایت ہے، جبکہ عملی صورت ہر دور میں اہل علم و اہل اختیار کے اجتماعی فیصلے سے طے ہوتی ہے، جذبات و فساد سے نہیں۔ یہی حدود اسلام کے حکمران کو مطلق العنان بادشاہ سے الگ کرتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حاکمیت کی بنیاد اللہ کی حاکمیت اعلیٰ، انسان کی خلافت اور شوریٰ کے نظام پر ہے۔ اسی روشنی میں حاکم یعنی امیر و خلیفہ عوام کا مالک نہیں بلکہ امانت دار نگران ہے، جس کی ذمہ داریاں عدل و قانون کا نفاذ، امن کا قیام، مالیات کی امانت داری، اہلیت پر تقرری اور رعایا کی فلاح ہیں اور جس کے اختیارات انتظامی فیصلوں، تعزیری پالیسی اور اجتماعی نظم تک وسیع ہیں مگر شریعت کے قطعی اصولوں، مقاصد کے بنیادی حقوق اور احتساب کی حدود کے تابع ہیں۔ مقاصد شریعہ کی نگاہ میں یہ نظام پانچوں ضروریات یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال کی اجتماعی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ وہ اقتدار کو خدمت و جواب دہی کی نظر سے دیکھے اور کسی بھی سیاسی صورت کا جائزہ نام کے بجائے ان اصولوں کی کسوٹی پر لے۔

سوال نمبر 5: احکام تکلیف کی بنیادی اقسام۔ فرض، واجب، سنت اور مباح (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ تکلیف کے احکام کی بنیادی اقسام کیا ہیں؟ فرض، واجب، سنت، اور مباح کی تعریف اور ان میں فرق کی وضاحت کریں۔ (20)

تعارف

احکام تکلیف اصول فقہ کا وہ بنیادی موضوع ہے جس میں مکلف کے افعال پر شریعت کے مطالبے کے درجات بیان کیے جاتے ہیں۔ سوال میں فرض، واجب، سنت اور مباح کی تعریف اور ان میں فرق پوچھا گیا ہے۔ یہ فرق محض کتابی درجہ بندی نہیں، روزمرہ کی دینی زندگی اسی سے مرتب ہوتی ہے کہ کس عمل کو چھوڑنا گناہ ہے، کس کو چھوڑنے سے نماز یا وضو پر اثر پڑتا ہے، کس عمل کی فضیلت ہے مگر ترک پر عتاب نہیں اور کس معاملے میں انسان کو اختیار ہے۔ اس جواب میں پہلے حکم تکلیفی کی تعریف اور اس کی مکمل سات درجوں والی تقسیم کا خاکہ دیا جائے گا، پھر سوال میں مطلوب چار اقسام کی الگ الگ تعریف، دلیل کی نوعیت و عملی اثر کے ساتھ، پھر ایک تقابلی جدول و شکل کے ذریعے فرق واضح کیا جائے گا اور آخر میں مکروہ و حرام کا مختصر ذکر کر کے نتیجہ پیش کیا جائے گا۔ فرق سمجھاتے وقت احناف اور جمہور کے اصطلاحی اختلاف کو بھی بیان کیا جائے گا کیونکہ فرض و واجب کا فرق اسی اختلاف سے پیدا ہوا ہے۔

ابتدا میں یہ اصولی بات ذہن نشین رہے کہ حکم تکلیفی حکم وضعی سے الگ ہے۔ حکم وضعی میں سبب، شرط ومانع جیسی چیزیں آتی ہیں جو کسی حکم کے لاگو ہونے کی علامت وشرط بنتی ہیں، جبکہ حکم تکلیفی براہ راست مکلف سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کوئی کام کرے یا اس سے رکے یا اسے اختیار دیا جائے۔ تکلیفی احکام کی کل درجہ بندی پانچ یا سات اقسام میں کی جاتی ہے۔ احناف کے نزدیک فرض، واجب، سنت یا مندوب، مباح، مکروہ تنزیہی، مکروہ تحریمی اور حرام سات درجے ہیں، جبکہ جمہور کے ہاں واجب و فرض کو عموماً ایک ہی درجے میں رکھا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ دلیل کی قطعیت وظنیت کا اصول ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

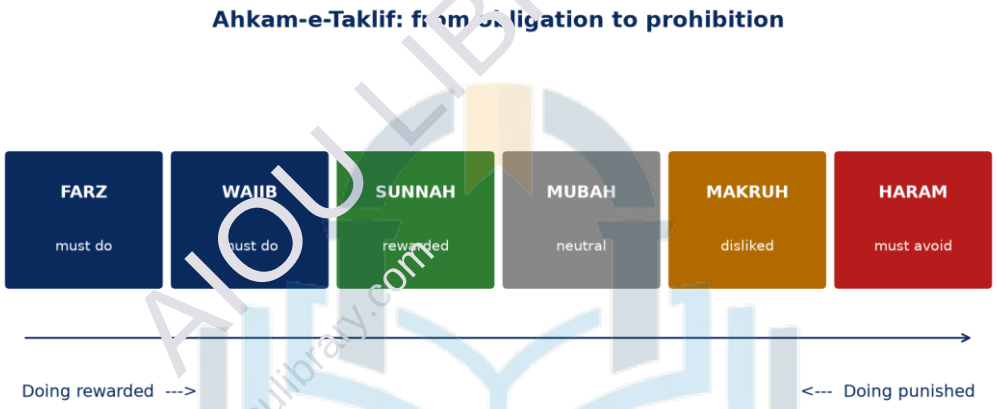

شکل: احکامِ تکلیف کے درجے — فرض سے حرام تک (مطالعے کے لیے خاکہ)

فرض کی تعریف

فرض وہ حکم ہے جس کا مطالبہ شریعت کی قطعی دلیل سے ثابت ولازم ہو اور جس کا کرنا ضروری واس کا بلا عذر چھوڑنا گناہ وسزا کا سبب ہو، اور جن عبادات میں وہ رکن کی حیثیت رکھتا ہو وہاں اس کے بغیر عبادت درست ہی نہ ہو۔ قطعی دلیل سے مراد وہ دلیل ہے جس کے ثبوت اور مفہوم دونوں میں کوئی شبہ نہ ہو، جیسے قرآن کی صریح آیت یا متواتر سنت۔ نماز، روزہ، زکاۃ وحج کی اصل حیثیت، نماز میں قیام وقراءت جیسے ارکان اور وضو میں بیان کردہ اعضا کا دھونا فرض کی مشہور مثالیں ہیں۔ فرض کا انکار، یعنی کسی ثابت شدہ فرض کو فرض ہی نہ ماننا، احناف وجمہور کے نزدیک نہایت سنگین بات ہے اور اعتقادی خطرے سے جڑی ہے، اس لیے فرض کی شناخت میں بہت احتیاط لازم ہے اور فرض کا

دعویٰ اسی پر ہو گا جس کی دلیل واقعی قطعی ہو۔ ترک فرض اور انکار فرض میں بھی فقہاء فرق کرتے ہیں؛ سستی سے چھوڑنے والا گنہگار ہے مگر انکار کرنے والے کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سخت اصولوں کے تحت دیکھا جاتا ہے اور اس کا فیصلہ عام آدمی کا کام نہیں، اہل علم و اختیار کا ہے۔

واجب کی تعریف اور فرض سے فرق

احناف کی اصطلاح میں واجب وہ حکم ہے جس کا مطالبہ لازم تو ہو مگر اس کی دلیل ظنی ہو یعنی اس کے ثبوت یا مفہوم میں اجتہادی گنجائش پائی جائے۔ اس کا کرنا لازم ہے اور بلا عذر چھوڑنا گناہ ہے، نماز و عبادت میں اس کے چھوٹنے سے بعض صورتوں میں سجدہ سہو یا اعادہ کی ضرورت بھی آتی ہے، مگر اس کا انکار فرض کے انکار کے درجے کا نہیں سمجھا جاتا۔ وتر کی نماز، نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت ملانا اور عیدین کی نماز احناف کے ہاں واجب کی معروف مثالیں ہیں۔ اس کے برعکس جمہور فقہاء فرض و واجب میں اصطلاحی فرق نہیں کرتے اور ہر لازم حکم کو دونوں ناموں سے یاد کرتے ہیں، مگر عملی درجے کی اس باریکی کو وہ بھی دوسرے الفاظ میں مان لیتے ہیں۔ لہٰذا اس فرق کو اصطلاحی اختلاف سمجھنا چاہیے، اساسی عقیدتی اختلاف نہیں؛ دونوں فریق مکلف کو لازم احکام کا پابند سمجھتے ہیں، اختلاف صرف درجہ بندی و دلیل کی نوعیت کی تعبیر میں ہے۔

سنت کی تعریف اور اس کی اقسام

سنت اپنے عام مفہوم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو کہتے ہیں، مگر احکام تکلیف کی درجہ بندی میں اس سے مراد وہ عمل ہے جس کا مطالبہ شریعت نے کیا ہو مگر لازم کے درجے میں نہ ہو؛ اسے کرنے پر ثواب ملتا ہے اور چھوڑنے پر فرض و واجب جیسی سزا و لازم گناہ مرتب نہیں ہوتا، البتہ اس کی عادت ڈالنا بے پروائی کا اظہار ہے۔ احناف کے ہاں سنت کی دو مشہور اقسام ہیں: سنت مؤکدہ جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشگی کی اور اس کے ترک پر عتاب بھی فرمایا، جیسے ظہر سے پہلے کی سنتیں و جماعت کا اہتمام وغیرہ؛ اور سنت غیر مؤکدہ یا زوائد جس پر ہمیشگی ثابت نہیں، جیسے عصر و عشاء سے پہلے کی چار رکعتیں۔ سنت مؤکدہ کا بلا وجہ ہمیشہ ترک کرنا فقہاء کے نزدیک قابل ملامت ہے، جبکہ سنت کی روح یہ ہے کہ انسان فرض و واجب کے بعد محبت و شوق سے اس درجے کو اختیار کرے۔ یہ درجہ اس لیے بھی اہم ہے کہ فرض میں کمی کا ازالہ قیامت کے دن نوافل و سنتوں سے ہونے کی امید احادیث میں بیان ہوئی ہے۔

مباح کی تعریف

مباح وہ عمل ہے جس کے کرنے اور نہ کرنے دونوں کی شریعت نے اجازت دی ہو اور اس پر بذات خود نہ ثواب لازم آئے نہ گناہ، جیسے حلال کھانا کھانا، جائز لباس پہننا، چلنا پھرنا اور جائز تجارت کی عام صورتیں۔ مباح زندگی کا سب سے وسیع دائرہ ہے اور یہی وسعت شریعت کی آسانی کی دلیل ہے کہ جہاں ممانعت نہیں وہاں اصل اباحت ہے، خصوصاً دنیاوی معاملات میں۔ تاہم مباح عمل نیت و نتیجے سے اپنا درجہ بدل بھی سکتا ہے؛ جو کھانا عبادت کی طاقت کے لیے کھایا جائے اس میں نیکی کا پہلو آ جاتا ہے، اور جو مباح کام کسی حرام کا ذریعہ بن جائے وہ سد ذرائع کے اصول کے تحت روکا جاتا ہے۔ اسی طرح مباح میں فضول خرچی و اسراف اسے ناپسندیدگی کی طرف لے جاتا ہے۔ لہٰذا مباح کا مطلب بے لگام آزادی نہیں بلکہ شرعی حدود کے اندر اختیار ہے، اور یہی اختیار انسان کی روزمرہ زندگی کو بغیر بوجھ کے چلنے دیتا ہے۔

جدول: فرض، واجب، سنت اور مباح کا تقابلی جائزہ

قسم	دلیل کی نوعیت	کرنے کا حکم	چھوڑنے کا اثر
فرض	قطعی دلیل	لازمی	گناہ؛ رکن ہو تو عبادت نامکمل
واجب (احناف)	ظنی دلیل، مطالبہ لازم	لازمی	گناہ؛ بعض صورتوں میں سجدہ سہو وغیرہ
سنت	غیر لازم مطالبہ	ثواب و فضیلت	لازم سزا نہیں؛ مؤکدہ کا ترک قابل ملامت
مباح	اجازت / عدم ممانعت	اختیار	بذات خود نہ ثواب نہ گناہ؛ نیت سے درجہ بدل سکتا ہے

مکمل خاکہ: مکروہ و حرام کا مقام

مطلوب چار اقسام کے ساتھ مکمل تصویر کے لیے باقی درجات کا مختصر ذکر بھی ضروری ہے۔ مکروہ وہ عمل ہے جس سے شریعت نے رکنے کا مطالبہ کیا ہو مگر حرام کے درجے میں نہ ہو؛ احناف کے ہاں اس کی دو صورتیں ہیں، مکروہ تنزیہی جو خلافِ اولیٰ یعنی بہتر کے خلاف ہو اور مکروہ تحریمی جو حرام کے قریب درجہ رکھے اور ظنی دلیل سے ثابت ہو۔ حرام وہ عمل ہے جس سے قطعی دلیل کے ساتھ لازمی طور پر روکا گیا ہو، جیسے قتلِ ناحق، چوری، سود اور شراب؛ اس کا کرنا گناہ کبیرہ و سزا کا سبب ہے اور اس کو حلال سمجھنا فرض کے انکار کی طرح سنگین اعتقادی معاملہ ہے۔ اس طرح پورا نقشہ یہ بنتا ہے کہ اوپر کے درجات میں کرنے کا مطالبہ بتدریج کم اور نیچے کے درجات میں رکنے کا مطالبہ بتدریج شدید ہوتا چلا جاتا ہے اور درمیان میں مباح اختیار کی جگہ ہے۔ اس خاکے کو یاد کر لینے سے فقہ کی کسی بھی کتاب میں کسی عمل کا حکم پڑھتے وقت طالب علم اس کا وزن و اثر فوراً سمجھ سکتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ احکامِ تکلیف کی بنیادی اقسام میں فرض قطعی دلیل سے ثابت لازم ترین حکم ہے، واجب احناف کی اصطلاح میں ظنی دلیل سے ثابت لازم حکم ہے جس کا درجہ فرض سے ایک قدم نیچے تعبیری اعتبار سے رکھا گیا ہے، سنت غیر لازم مطلوب عمل ہے جس پر ثواب ہے اور ترک پر لازم سزا نہیں اور مباح وہ اختیار والا عمل ہے جو بذاتِ خود ثواب و گناہ سے خالی ہے مگر نیت و نتیجے سے اس کا درجہ بدل سکتا ہے۔ مکروہ و حرام اسی نقشے کے ممانعت والے درجات ہیں۔ ان درجات کا فرق سمجھنا عملی دینداری کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ انسان فرائض کو اولیت دے، واجبات کی پابندی کرے، سنتوں کو محبت سے اپنائے اور مباحات میں حد اعتدال رکھے۔ اسی ترتیب و ترجیح کا نام فقہی بصیرت ہے اور یہی اس سوال کا اصل سبق ہے۔